Research Journal
Tahqeeqat

ریسرچ جرنل
تحقیقات

eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334

ناول "ایک معدوم کہانی" از سیمیں کرن: تجزیاتی مطالعہ

Analytical study of Seemen Kiran's novel "Aik Madoom Kahani"

Dr. Sumaira Akbar
Assistant Professor, Deptt of Urdu, Government College University, Faisalabad

ڈاکٹر سمیرا اکبر
اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Dr. Abdul Aziz Malik
Assistant Professor, Deptt of Urdu, Government College University, Faisalabad

ڈاکٹر عبدالعزیز ملک
اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Abstract

Seemen Kiran is an important and emerging name in contemporary Urdu fiction. Her three anthologies of short stories and two novels have been published. Her recent novel "Aik madoom Kahani" has been published in 2022. It is the story of an extinct generation that is moving from one era to another. This novel revolves around the triangle of extinction, conservation and wisdom. The greatest quality of this novel is the questions raised by the novelist. To raise a question in a traditional society is an act of great courage and bravery, which the novelist has done brilliantly. Feminism is also a topic of this novel. In it, suffering and life of a woman in the developing eastern society and the developed western society have been made the subject. The special thing in the novel is the political and social consciousness of the novelist.

Keywords: *Seemen Kiran, Urdu Novel, Aik Madoom Kahani, America, Faisalabad, Covid 19, Wisdom*

ناول "ایک معدوم کہانی" سیمیں کرن کا دوسرا ناول ہے جو 2022 میں فکشن ہاؤس، لاہور سے شائع ہوا۔ سیمیں کرن معاصر اُردو فکشن کا ایک اہم اور اُبھرتا ہوا نام ہے۔ اس ناول سے قبل ان کے تین افسانوی مجموعے اور ایک ناول شائع ہو کر علمی و ادبی حلقوں سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "شجر ممنوعہ کے تین پتے" کے نام سے شائع ہوا۔ دوسرا افسانوی مجموعہ "بات کہی نہیں گئی" اور تیسرا افسانوی مجموعہ "مربعوں کی دائرہ کہانی" کے عنوان سے شائع ہوا۔ سیمیں کرن نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز نوعمری میں ہی کر دیا تھا۔ شادی سے پہلے وہ نظمیں اور کہانیاں لکھتی تھیں لیکن اپنی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز شادی کے بعد کیا۔

ناول "ایک معدوم کہانی" مارک ٹوین کے قول "دانش اور خوشی کا یکجا رہنا ناممکن ہے" سے شروع ہوتا یہ ناول تین ابواب (مارک ٹوین کے دیس میں، سنہری دنوں کی دو ڈائریز، کہانی ختم ہوتی ہے) پر مشتمل ہے۔ یہ ایک معدوم ہوتی ہوئی نسل کی کہانی ہے جو ایک عہد سے دوسرے عہد یا یوں کہیے کہ قدیم عہد سے جدید عہد میں داخل ہو رہی ہے۔ جنریشن گیپ یا وسیع معنوں میں نئی اور پرانی تہذیب کی کشمکش اس ناول کا موضوع ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی بالخصوص انٹرنیٹ کے باعث دنیا گلوبل ویلج بن گئی اور بیسویں صدی کے نصف آخر میں پروان چڑھنے والی نسل نے ان تبدیلیوں کو زیادہ تیزی سے دیکھا اور سہا ہے اس لیے ان کی لباس، خوراک، سوچ، روایات، اقدار، اخلاقیات سب کچھ سرعت سے بدل رہا ہے۔ نئی اور پرانی تہذیب کی کشمکش کئی تخلیق کاروں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ اُردو ناول میں

OPEN ACCESS HEC DRJI ISSN INTERNATIONAL STANDARD SERIAL NUMBER INTERNATIONAL CENTRE اشاریہ اردو جرائد EuroPub

ڈپٹی نذیر احمد کے "ابن الوقت" سے لیکر عزیز احمد کے ناول "گریز" اور سرحد پار سید محمد اشرف کے ناول "آخری سواریاں" تک یہ موضوع اُردو ناول کا محبوب موضوع رہا ہے۔ سیمیں کرن کا یہ ناول مذکورہ بالا ناولوں سے تھوڑا مختلف یوں ہے کہ یہ ناول معدومیت، قدامت اور دانش کی تکون کے گرد گھومتا ہے۔

"ایک معدوم کہانی" میں ناول نگار نئے عہد کے انسان (روحا، ہاشم) کو اس مٹتی ہوتی ہوئی تہذیب کا استعارہ کہتی ہے جو معدوم ہوتی دانش کا آخری کمیاب ایڈیشن ہیں۔ ناول میں وقت کو ایک بوڑھے جادوگر سے تشبیہ دیتی ہے جس کے ہاتھ میں ایک جادو بھرا گول پہیہ ہے۔ وہ مکافات عمل جیسی چکی کو اپنی چھڑی سے آہستہ آہستہ گھماتا چلا جاتا ہے اور اس چکی میں معدوم اور قدیم دانش باریک آٹے کی طرح پستی چلی آرہی ہے، اس آٹے کو موجودہ اور آنے والی نسلیں کھا کر قدیم دانش کو پھر سے اُگل دیتی ہیں۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی ناول نگار کی طرف سے اُٹھائے گئے سوالات ہیں۔ سوال دانش کی ابتدا ہے ،بنی نوع انسان کے ارتقا اور لامتناہی ترقی کے پیچھے اسی سوال کی طاقت کار فرما ہے۔ یہ ناول قاری کے سامنے کئی سوالات رکھتا ہے اور یہ سوالات متنوع جہات ہے، جو ناول نگار کے ذہانت و ذکاوت پر دال ہے۔ ایک روایتی معاشرے میں سوال اٹھانا بڑے حوصلے اور بہادری کا کام ہے جو ناول نگار نے عمدگی سے انجام دیا ہے۔

قدیم اور معدوم دانش کے متعلق ناول میں کئی سوالات اٹھائے گئے ہیں، جیسا کہ قدامت کو دانش سے کیوں منسوب کیا جاتا ہے؟ وہ خاندان، وہ روایات جو معدوم ہو جاتی ہیں یا کر دی جاتی ہیں کیا ان میں دانش کا مادہ کم ہوتا ہے؟ کیا حملہ آور دانش زیادہ قوی ہوتی ہے؟ یا وقت کا دائرہ مقدر بن کر خود کو دہراتا ہے؟ ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "یہ یہیں اسی کنکٹیکٹ میں وہ میوزیم تھا جہاں اس سرزمین کے قدیم ترین رہائشی ڈائنو سارز کے پنجوں کے نشانوں کو محفوظ کر لیا گیا تھا۔ وہ قدامت کے امین، پہاڑوں جیسے جسامت کے حامل مگر جب قدامت، دانش کو ارتقاء نہ دے سکی تو معدوم ہو گئی اور وہ جو یہاں کے اصل باسی تھے، جو کبھی ایوریجنل تھے اور اب نیٹو امریکن کہلاتے ہیں وہ قدامت کا عذاب بھگتے رہے مگر کیوں؟ کیا اپنی سرزمین پر اپنی اصل کے ساتھ رہنا کوئی جرم تھا؟ جرم شاید ضعیفی تھا؟(1)

اس ناول کا ایک موضوع حقوقِ نسواں بھی ہے۔ اس میں ترقی پذیر مشرقی معاشرے اور ترقی یافتہ مغربی معاشرے کی عورت کے دُکھ، مصائب اور زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ سوچنے، سمجھنے اور آگہی رکھنے والی عورت کا وجود دونوں معاشروں کو گوارا نہیں۔ مزاحمت کرنے والی عورت کو دونوں معاشروں میں باغی سمجھا جاتا ہے اور ہر سماج میں اس کا مقام ابتر ہے۔

یہ ناول مشرقی معاشرے کی ایک پڑھی لکھی لکھاری کنول کی داستانِ حیات ہے۔ ایک باشعور عورت کو ہمارے معاشرے میں صرف ایک جسم سمجھا جاتا ہے اور اسے تسخیر کر لینے کے بعد اسے کے وجود کو انتہائی معمولی تصور کیا جاتا ہے۔ اسے اپنا جیسا انسان سمجھنا تو درکنار ، انسان ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اس صورتحال میں آگہی عذاب بن جاتی ہے۔ سوچنے والی بالخصوص لکھنے والی عورت کو ویسے ہی مرد اساس معاشرے میں بُرا سمجھا جاتا ہے۔ یہاں بنت حوا ہونا جُرم ہے اور "لکھنا" تو اس سے بھی کڑا جُرم ہے کنول کا شوہر مرد اساس معاشرے کے مردوں کی اکثریت کی سوچ کی عکاس ہے جو عورت کی گھر کی چاردیواری میں قید کر کے بچوں کی پیدائش اور پرورش تک محدود کر دیتے ہیں اور خود گھر سے باہر کئی خواتین کے ساتھ عیاشی کرتے ہیں اور پکڑے جانے پر یہ اس سب کو اپنا استحقاق سمجھتے ہیں۔ اس ساری صورتحال میں عورت کس ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی کرب سے گزرتی ہے، اس کے بچوں کی شخصیت کس طرح دائو پر لگ جاتی ہے، اس ناول میں عمدگی سے دکھایا گیا ہے۔ خورشید اکرم کے مطابق:

> "ایک معدوم کہانی، مشرقی معاشرے کی ایک حساس لڑکی اور مردانہ سماج کی آلائشوں میں لتھڑے ایک مرد کے بے جوڑ ربط اور اس کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے والی طویل کشاکش ، پیچیدگیوں اور الجھائوں کی ایک المناک داستان ہے۔ ایک ایسی المناک داستان جو شاید اس ماحول و معاشرہ کا ایک حصہ ہے۔ مگر بڑا المیہ یہ ہے کہ اس المناکی کے بطن سے کوئی ایسا جوالا نہیں پھوٹتا جو اس ناہمواری کو تہہ و بالا کر دے۔"(2)

تاہم اس ناول میں حقوق نسواں اور معاشرے میں خواتین کی حیثیت و کردار کے بارے میں جو چنگاریوں جیسے سوالات اُٹھائے گئے ہیں وہ بھڑکنے کی پوری صلاحیت اور طاقت رکھتے ہیں۔ ناول نگار مغربی معاشرے کی بدنام زمانہ عورت سیم گپتا اور مشرقی معاشرے کی انیتا جیسے بدنام زمانہ کرداروں کے ذریعے کئی سوال اٹھاتی ہیں بہت تلخ سوالات۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "کردار ہمیشہ عورت سے وابستہ کوئی شے کیوں سمجھا جاتا ہے؟ کیا مرد کا کوئی کردار نہیں ہوتا؟ دوشیزگی کنوارگی، محبت کا ایثار کرنے والی عورت۔ یہ چیزیں گر عورت کے کردار کا تعین کرتی ہیں تو مرد کا کردار کس پیمانے پر ناپا جاتا ہے؟ کیا واقعی اس کے لیے کوئی پیمانہ ہے یا نہیں ہے اور اگر ہے تو عورت سے الگ کیوں ہے؟ آخر عورت کا یہ پیمانہ توڑنے کا براہ راست مجرم اور قصوروار برابر کا شریک مرد ہی ہوا کرتا ہے۔ تو مرد اتنا ہی مجرم کیوں نہیں؟(3)

پردہ بکارت کے بارے میں سوال اُٹھاتے ہوئے کہتی ہیں کہ کیوں عورت کو ہی اس پُل صراط سے گزرنا پڑتا ہے، اچھی اور بُری عورت کے لیے اسے کیوں معیار بنایا گیا ہے۔ ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"کیا تم، میں، ہر شادی شدہ عورت بُری یا کمتر عورتیں کیونکہ ہم نے اپنی بکارت کھو دی ہے؟ کیا مرد جو ہمارے ساتھ تھا اس کی بکارت نہیں ٹوٹی؟ مگر کیوں؟ اچھی بُری عورت یقیناً ایک پردے کے ہونے نہ ہونے سے نہیں بنتی۔ بَس دنیا میں دو طرح کے انسان ہوتے ہیں، اچھے انسان اور بُرے انسان، یہی سب سے بڑا سچ ہے۔"(4)

اس ناول کا ایک موضوع رواداری بھی ہے۔ آنٹی لنڈا اور جمشید کی جوڑی رواداری کی شاندار مثال ہیں۔ پاکستانی اور مسلمان جمشید، امریکن عیسائی لنڈا مثالی جوڑے کی مانند زندگی گزار رہے ہیں جن کے تین بچے مذہب کے معاملے میں آزاد ہیں۔ اس کا بیٹا ٹیکساس یونیورسٹی میں پڑھتا ہے، ایک بیٹی نیویارک میں مقیم ہے اور ایک میساچوسٹس میں۔ آنٹی لنڈا اب بیوگی کی زندگی گزار رہی ہے اور ہاشم اور روحا کے ہمسائے میں رہتی ہے۔ وہ بہت محبت کرنے والی خاتون ہے ہاشم اور روحا کو اپنے بچوں کے جیسا پیار کرتی ہے۔ گارڈننگ کرتی ہے، کتابیں پڑھتی ہے، پالتو جانوروں کے ساتھ مصروف رہتی ہے۔ یعنی بزرگ اپنے چھوٹوں کو اپنے احسانات کے بوجھ تلے دبائے بغیر ایک آسودہ، متحرک اور مثبت زندگی گزار سکتے ہیں۔

ناول میں خاصے کی چیز ناول نگار کا سیاسی اور سماجی شعور ہے۔ اس کے قبل طاہرہ اقبال کے ناول "نیلی بار" میں بھی پاکستان کی سیاسی تاریخ کو عمدگی سے سمویا گیا ہے۔ سیمیں کرن بھی پاکستان کے سماج اور سیاست پر گہری نظر رکھتی ہیں جس کا اظہار ان کے کالموں میں بھی ملتا ہے۔ "ایک معدوم کہانی میں" نئی نسل کے نمائندہ روحا اور ہاشم کے ذریعے ناول نگار اپنے سیاسی نظریات اور خیالات کی پرچار کرتی ہیں۔ ناول نگار کا ماننا ہے کہ نئی نسل کا سیاسی شعور اپنے بزرگوں کی نسبت خاصا پختہ ہے۔ وہ عالمی اور مقامی سیاست اور طاقت وروں کے ہتھکنڈوں سے زیادہ واقف ہیں، اس لیے پاکستان کے سیاسی نظام کے بارے میں کئی سوالات اُٹھاتے ہیں:

"ایک جانب ایک پوسٹ کولونئیل معاشرہ جو محض ستر برس پیشتر برطانوی چنگل سے نکلا تھا مگر کیا واقعی نکل آیا تھا؟ کیا سو سو برس کے پٹے پر دی گئی جاگیریں اور ان کے مالک جاگیر دار اَب بھی عالمی استعماری قوتوں کے حمایت دار نہیں ہیں؟ کیا ملکی سیاسی تبدیلیاں اُس جانب اشارے نہیں کرتیں۔(5)

"ہماری سیاسی پارٹیاں چاہے وہ دائیں بازو کی ہوں یا بائیں کی۔ اسی سٹیٹس کو اور پوسٹ کولونئیل ملک کا فیوڈل زدہ معاشرہ ہے جو پدرسری سماج کی تمام تر علتیں لیے ہوئے ہیں۔ اب

یہ نام ہی دیکھو بلاول۔۔ بھٹو۔۔ زرداری یہ نام اپنی جگہ ایک چیختا ہوا سلوگن ہے جو بہت کچھ ننگا کر دیتا ہے۔"(6)

اس نڈر سوالات کے علاوہ پاکستان کے سیاسی عدم استحکام اور عوام کی سادہ لوحی کا تجزیہ ناول میں عمدگی سے کیا گیا ہے۔ پاکستان میں سیاسی تاریخ میں آمرانہ حکومتوں کے تاریک پڑاؤ بھی پڑتے ہیں، ان کے اسباب و محرکات پر گفتگو کرنا، سیاسی صورتحال پر بے لاگ تبصرے کرنا ناول نگار کی سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ عزم و ہمت کے بھی آئینہ دار ہیں، اس ضمن میں ناول سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"اِس ملک کو جو لیڈر میسر ہوئے وہ اسٹیبلشمنٹ کی کیاریوں میں پھلے پھولے سو اُن کی سیاسی بنیاد ہی ناقص رہی اور ملک پر اصل راج سول اور ملٹری اسٹیبلشمنٹ کا ہی رہا۔ سادہ لوح عوام کی ذہن سازی ہی کچھ ایسے کی گئی کہ اُن کے نزدیک سب غدار تھے سوائے ایک ادارے کے جب کہ ایک سیاسی جدوجہد سے نمودار ہونے والے ملک میں اس مستحکم سیاسی نظام کا غیر مستحکم ہونا بذات خود ایک بہت بڑا المیہ تھا۔"(7)

"پاکستان بننے کے بعد اسے ایک اسلامی ریاست بنے کا خواب دیکھنے والے معصوم لوگ، کشمیر کو آزاد دیکھنے کا خواب لیے ہوئے لوگ، وہ لوگ جن کا جھکاؤ مذہب کی طرف تھا یہی وہ لوگ تھے جو انتہاؤں میں جا کر افغان جہاد میں کام آئے اور پھر انھیں میں سے آگے جا کر دہشت گرد بن گئے۔ جہاد بھک سے اڑ گیا، مفادات ٹکرانے لگے اور یہ ٹکراؤ ملک میں دہشت گردی اور خودکش دھماکوں کی صورت لہو بکھیرنے لگا۔ سوات اور جنوبی وزیرستان دہشت گردوں کی نرسریاں بن گئے۔ پشاور میں سانحہ آرمی پبلک سکول اور اس کے علاوہ بلوچستان، اور پنجاب میں خاص طور پر لاہور خون، خاک، کٹے پھٹے اعضاء اور نئی کہانیاں۔"(8)

اُس کا وطن ستر برسوں میں لگاتار سیاسی عدم استحکام کا شکار تھا۔ فوجی حکومتوں کے درمیان لڑکھڑاتی ہی جمہوریتیں بیساکھیوں پہ آتیں اور پیچیدہ حالات اور گراس روٹ لیول تک اختیارات کی رسائی کے چکر میں بری طرح ٹھوکر کھا کر گرتی رہیں اور پھر فوجی حکومتوں کی آلہ کار بن گئیں اور جب ہوش آیا تو انھیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ جس ملک میں جمہوریت کا یہ حال ہو وہاں قانون کی حکمرانی اور بنیادی حقوق دونوں ایک مذاق سا بن کر رہ جاتے ہیں۔(9)

پاکستان کی تاریخ میں ایک اور سیاہ اور دردناک باب سقوطِ ڈھاکہ یا پاکستان کا دولخت ہو جانا بھی ہے۔ اس سانحے کے اسباب و محرکات کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا، صحافتی تحریروں کے علاوہ اردو ادب میں بھی اس سانحے پر بہت سا ادب تخلیق ہوا۔ اس حوالے سے زیادہ تر پاکستان اور اس کے لوگوں کا بیانیہ دکھائی دیتا ہے لیکن اس ناول میں ناول نگار ایک کردار دیپالی کے ذریعے بنگالیوں کے بیانیے کو بھی پیش کیا ہے۔ دیپالی اپنے ابا کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتی ہے:

"وہ ببانگ دہل کہتے کہ بنگال کی تقسیم اور پاکستان کا الحاق دونوں غلط تھے۔ پاکستان کا دوسرا مطلب پنجاب کی حکومت تھی اور پنجابی بنگالی کو جس نظر سے دیکھتا تھا وہ کبھی ساتھ رکھنے والی نہ تھی۔ یہ مکمل دو الگ زمینیں اور دو الگ تہذیبیں تھیں جنھیں مذہب کی کمزور سان پر چڑھانے کی کوشش کی گئی اور اس کو علیحدہ ہونا ہی تھا۔"(10)

ایک مقام پر دیپالی کہتی ہے:

"تم لوگوں کا حسین شہید سہروردی ایک سچا محب الوطن پاکستانی تھا۔ ایک قد آور لیڈر جسے نظر انداز صرف بنگالی ہونے کے جرم میں کیا گیا۔ اس کو کراچی مزار قائد میں دفن کرنے کے لیے جگہ نہ ملی۔ تب صدر ایوب کی حکومت تھی تو سوچو کہ ملک کے سابق وزیر اعظم کو مغربی پاکستان میں قبر کے لیے دو گز جگہ بھی نہ مل سکے یہ کتنا بڑا نسلی تعصب ہے۔"(11)

"ایک معدوم کہانی" میں ناول نگار سماجی اور معاشرتی برائیوں، ہمارے غلط رویوں کو کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح ڈائگنوس کرتی ہیں، نہ صرف بیماری کی نشاندہی کرتی ہیں بلکہ دوا بھی تجویز کرتی ہیں۔ انگریز لکھاری مارک ٹوئن میوزیم کی سیر کرتے ہوئے روحال کو خیال آیا کہ ہم اپنے شاعروں اور ادیبوں کے گھروں کو یوں میوزیم میں تبدیل کر کے انہیں عزت کیوں نہیں دیتے؟

"امریکیوں کی چابک دستی اور بزنس سکلز ہیں نا کہ وہ تاریخی ورثہ نہ ہونے کے باوجود اپنا ایک ورثہ تخلیق کرنے پر قادر ہو گئے ہیں۔ ہمارے پاس ایسے ٹیلنٹ کی کمی تو نہیں۔ دور کیا جانا ہما را تارڑ ایک لونگ لیجنڈ ہے کیا اس کے نام پر کوئی انوکھی یادگار اس کی زندگی میں تعمیر نہیں ہو سکتی۔ ہم اسے یہ عزت اس کی زندگی میں کیوں نہ دیں۔ مگر نہیں ہم نے تو وہ جو چلے جاتے ہیں ان کو بھی یہ مرتبہ دینا گوارا نہیں کیا۔ اب لاہور میں عبد اللہ حسین، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، ابن انشا، منٹو، انتظار حسین واصف علی واصف وغیرہ

کے گھروں کو میوزم بنا دیا جائے تو یہ لاہور کی ہی نہیں پاکستان کی بھی کتنی شان بڑھا دے گا۔(12)

ناول نگار اور بھی کئی جگہ مغربی طرز زندگی، سوچ، فکر اور رویوں کا تقابل کرتی ہیں اور پاکستانی معاشرے کی کجیوں کو بہت عمدگی سے ناول کا حصہ بناتی ہیں۔ ناول میں ایک مقام پر امریکہ اور پاکستان کے عوام کا تقابل کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

یہاں اور قانون کی پاسداری زندگی کو سہولت بھر اسانس ضرور میسر کرتی تھی۔ گو کہ ایک پُر تعیش زندگی گزارنے کو جہاں ہر شخص مگن، مصروف اور جلدی میں تھا۔ جہاں ہر سفید پوش اور متوسط طبقے کو فکر تھی کہ وہ اتنے ڈالر کمالے جس میں گھر داری کے ساتھ ساتھ ٹیکسز ادا ہو سکیں۔ بھاری ٹیکسوں کی ادائیگی یہاں ادا کرنا مشکل تھی۔ اتنی ہی سہولیات عوام کو میسر تھیں جتنے ٹیکس وہ ادا کر رہے تھے۔ عمومی طور پر کاروباری اوقات صبح ۹ بجے سے شام ۵ بجے تک ہیں۔ جہاں تین شفٹوں میں کام ہوتا ہے وہاں پہلی شفت صبح سات بجے سے شام چار بجے تک پھر شام چار سے رات بارہ بجے تک اور آخری آدھی رات سے صبح تک۔ اس شفٹ میں لوگ زیادہ رقم کما لیتے۔ ہر شخص اپنی دھن میں مگن اور بے خبر اپنے دائرے میں گھوم رہا ہے۔ اپنی جاب، لائف اور ویک اینڈ کی پلاننگ۔ یہی امریکی زندگی کا دائرہ ہے۔ پاکستانیوں کی طرح نہ ان کے پاس وافر وقت تھا نہ مزاج کہ وہ دیگر مشاغل میں دبلے ہوں۔ ہمارے پاس بے شمار وقت ہے جو کہ چغلی کے لیے وافر ہے۔ سیاست کی فکر میں دبلے ہونا اور وقت آنے پر یا تو روٹ ہی نہ ڈالنا یا پھر اپنی برادری یا دیگر مفادات کو مد نظر رکھ کر ووٹ کو بیلٹ باکس کے کنویں میں پھینک آنا، ہر کام حکومتی سطح سے لے کر نیچے تک بغیر پلاننگ کے کام کرنا پاکستانی اختصاص ہی کہلایا جا سکتا ہے۔(13)

ناول میں کرونا وبا اور اس کی آفت سامانیوں کا تذکرہ بھی بہت جزئیات کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس وبا سے کس طرح تیز رفتار دنیا کا پہیہ ایک دم رُک گیا، لوگ سماجی فاصلہ اپناتے ہوئے گھروں میں مقید ہو گئے۔ بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک اس وبا کے سامنے ریت کی دیوار کی مانند بے بس نظر آئے۔ اس وبا نے کس طرح ایک انسان کے رویوں کے ساتھ ساتھ اس کے سوچنے کا ڈھنگ جس طرح سے تبدیل کر دیا اس ناول کے صفحات میں عمدگی سے دکھائی دیتا ہے۔

ناول کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ نصف اول ناول کا زمان و مکان اکیسویں صدی کا امریکہ ہے اور نصف آخر ناول کا زمان و مکان بیسویں صدی کے ربع آخر کا پاکستان (بالخصوص فیصل آباد، لاہور) ہے۔ ناول میں کہانی بیان کرنے کے لیے ایک نئی تکنیک ڈائری کی تکنیک کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس سے قبل مکتوب کی تکنیک (Epistolary) کا استعمال تو اُردو ناول میں دکھائی دیتا ہے لیکن ڈائری کی تکنیک یوں نہیں برتی گئی۔ یہ ناول 1986 کی دو ڈائریوں کے ذریعے کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ ایک ڈائری روحا کی والدہ کنول کی ہے دوسرے اس کے والد کی۔ ان ڈائریوں سے صرف کہانی ہی آگے نہیں بڑھتی، بلکہ یہ ڈائریاں ایک طرح کی ٹائم مشین ہیں جس سے قاری ماضی کی جانب عازم سفر ہوتا ہے۔ اور اس دور کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات پوری جزئیات اور آب و تاب کے ساتھ قاری کے سامنے عیاں ہو جاتے ہیں۔

ناول کے شروع میں راوی روحا ہے اور آخر میں روحا کی والدہ کنول۔ ناول میں کئی بار غائب راوی کو بھی برتا گیا ہے۔ ناول کی ابتدائی حصے میں امریکہ اور آخری حصے میں فیصل آباد کی منظر نگاری کچھ اتنی جزئیات نگاری اور تفصیل سے کی گئی ہے کہ بعض مقامات پر یہ ناول سے زیادہ حقائق پر مشتمل تاریخ کی کتاب کا گمان گزرتا ہے، جو اس ناول کی کمزوری ہے۔ مجموعی طور پر ایک بڑے کینوس کا ناول ہے جس میں قدیم و جدید کے مابین تفاوت، وقت، زندگی موت، سماج، کائنات کے متعلق کئی قابل قدر سوال اٹھائے گئے ہیں اور ناول کے اختتام اور سیمین کرن کی دوسری کہانیوں کی پڑھت سے ناول کے فلیپ پر موجود مستنصر حسین تارڈ کی رائے سے درست معلوم ہوتی ہے کہ سیمیں کرن فکشن کے گنے چنے عمدہ لکھاریوں میں سے ایک ہے اور یہ ناول ثابت کرتا ہے کہ وہ اس روشنی کی جانب بڑھ رہی ہیں کس کی ہر ادیب کو تلاش ہوتی ہے اور وہ کسی کسی کے نصیب میں ہوتی ہے، مجھے یقین ہے کہ اس معاملے میں خوش بخت رہے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ سیمیں کرن، ایک معدوم کہانی، (لاہور: فکشن ہائوس، 2022)، ص69
2۔ ایضاً، ص فلیپ
3۔ ایضاً، ص248
4۔ ایضاً، ص108، 107
5۔ ایضاً، ص19
6۔ ایضاً، ص136
7۔ ایضاً، ص17
8۔ ایضاً، ص21

9۔ ایضاً، ص19

10۔ ایضاً، ص158

11۔ ایضاً، ص192

12۔ ایضاً، ص150

13۔ ایضاً، ص17

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havalajat

1. Seeman Kiran, Ek Madum Kahani, (Lahore: Fiction House, 2022), p. 69.
2. Ibid, p. flap
3. Ibid, p. 248
4. Ibid, pp. 107, 108
5. Ibid, p. 19
6. Ibid, p. 136
7. Ibid, p. 17
8. Ibid, p. 21
9. Ibid, p. 19
10. Ibid, p. 158
11. Ibid, p. 192
12. Ibid, p. 150
13. Ibid, p. 17